OPEN ACCESS
Al-ISRA
International Journal of Islamic Thought
ISSN: 2959-3603
www.israjr.com

Al-ISRA
Vol.:5, Issue: 1, Jan -March 2026 PP: 268-289

بین الریاستی تعلقات میں اسلام کا تصور جنگ

Concept of War in Islam in Inter-State Relations

Dr. Muhammad Younus javaid
Lecturer, Govt. Islamia Graduate College Kasur
Email: younusjavaid@gmail.com

Hafiza Humera Iram
Lecturer, Govt. Associate College (W) Quiadabad, Khushab
Email: humairapk786@gmail.com

Abstract

Islamic Shariah laws have purified not only the objectives of war, but also the methods of war. It has set and defined some objectives for war, that it can only be for: the supremacy of Allah, respect for humanity, supporting the oppressed, elimination of strife and corruption, and the establishment of peace and security. In this way, all those inhumane methods which were prevalent all over the world before Islam were completely abolished. Moreover, war was bound by ethical principles. Until the beginning of the 17th century, Europe was completely unaware of even the concept of laws of war. In theory and in practice, war was considered exempt from moral limits and the restrictions of rules and regulations, and combatants had the absolute and unlimited right to inflict harm upon each other. Adherence to treaties and covenants, treatment of prisoners of war, burial of the enemy's dead, what treatment should be given to the enemy when he lays down arms, how quickly weapons should be set aside when the enemy shows inclination toward peace-and similar other battlefield instructions-are such bright torches of guidance that if war is fought without taking guidance from them, there remains no difference between humans and animals.

Keywords: *war, objectives, methods, humanity, peace, security, Islamic guidance.*

جہاد کی اصطلاح

اسلام میں جنگ کی جگہ جہاد یا قتال کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ جہاد ایک وسیع مفہوم کا حامل لفظ ہے جبکہ اس کے مقابلہ میں 'قتال'

ایک نسبتاً کم وسیع معانی و مفہوم رکھتا ہے۔ جہاد کا لفظ "جہد" سے مشتق ہے۔ شرعی اصطلاح کے لحاظ سے یہ دو مفاہیم میں مستعمل ہے۔ وسیع مفہوم کے لحاظ سے دین کی سربلندی اور حفاظت کے لیے کی جانے والی کوشش جہاد شمار ہوتی ہے۔ جبکہ دوسرا مفہوم خاص معانی میں دین کی سربلندی اور حفاظت کے لیے کی جانے والی مسلح جدوجہد ہی جہاد کہلاتی ہے جسے "قتال" سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ گویا 'قتال' جہاد ہی کی ایک قسم ہے۔ بعض اوقات جہاد اور قتال مترادف الفاظ کے طور پر بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔[1] جہاد اور قتال دونوں اصطلاحیں قرآن وحدیث میں کئی جگہوں پر بیان ہوئی ہیں۔ قتال کے مقابلہ میں جہاد کی اصطلاح مکی دور میں ہی قرآن مجید میں ذکر ہوئی ہے جیسا کہ ارشاد ہوا:

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَاۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ2

(اور جو لوگ ہمارے لیے کوشش کرتے ہیں ہم ضرور ان پر اپنی راہیں کھول دیں گے، اور یقیناً اللہ نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔)

سورہ حج میں بھی اس لفظ کو یوں بیان کیا گیا ہے:

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ3

(اور اللہ کی راہ میں جدوجہد کرو جیسا کہ اس کے لیے جدوجہد کا حق ہے۔)

امام ابن تیمیہؒ نے جہاد کے وسیع مفہوم کے بارے میں یوں لکھا ہے:

"الجهاد اماأن يكون بالقلب كالعزم عليه، أوبالدعوه الى الاسلام وشرائعه، أوباقامه الحجةعلى المبطل، أوبيان الحق وازالة الشبهة،أوباليراى والتدبيرفى مافيه نفع المسلمين، أوبالقتال نفسه فيجب الجهادبغاية بمكنيه۔"[4]

(جہاد یا تو دل کے ذریعے کیا جاتا ہے جیسے جہاد کا عزم، یا اسلام اور اس کے احکامات کی طرف دعوت کے ذریعے، یا غلط کاروں پر حجت قائم کرکے، یا حق کی وضاحت اور شبے کے ازالے کے ذریعے، یا مسلمانوں کے نفع کے کام کے لیے فکر اور تدبیر کے ذریعے، یا نفس قتال ہی کے ذریعے، پس جو ذریعہ بھی ممکن ہو اس کے ذریعے جہاد واجب ہے۔)

قتال یا مسلح جہاد کے بارے میں آیات کا نزول بعد از ہجرت مدنی دور مبارکہ میں ہوا کیونکہ اسلامی ریاست مدینہ کو کفار مکہ، یہود اور دیگر شر پسند عناصر کی ریشہ دوانیوں سے بچاؤ کے لیے اقدامات ناگزیر ہوگئے تھے۔ الکاسانی بدائع الصنائع میں لکھتے ہیں کہ قانونی اصطلاح میں جہاد سے مراد اللہ کی راہ میں بھرپور صلاحیتوں کے ساتھ جان، مال، زبان اور دوسرے ذرائع سے لڑائی کرنا ہے۔[5] اکثر فقہاء کرام نے جہاد کے بارے میں اسی سے ملتی جلتی تعریفیں بیان کی ہیں۔ تاہم فقہاء اسے فرض عین کی بجائے فرض کفایہ قرار دیتے ہیں۔ اس کی دلیل وہ قرآن پاک کی اس آیت سے لیتے ہیں:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ6

(اور مسلمانوں کو یہ نہ چاہیے کہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں۔ سوایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جائے تاکہ وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں اور یہ لوگ اپنی قوم کو جب وہ ان کے پاس آئیں ڈرائیں تاکہ وہ ڈر جائیں۔)

اسلام کا قانون جنگ

اسلام امن وآشتی کا دین ہے۔اس نے انسانی جان کی حرمت کو بڑا مقدم اور محترم قرار دیا ہے۔قرآن پاک میں ارشاد ہے:

مَن قَتَلَ نَفْسًابِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْفَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَ نَّمَاقَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَافَكَأَ نَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا[7]

(جو کوئی کسی کی جان لے، بغیر اس کے کہ اس نے کسی کی جان لی ہو یا زمین میں فساد کیا ہو، تو گویا اس نے تمام انسانوں کا خون کیا۔اور جس نے کسی کی جان بچائی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو بچایا۔)

ایسا دین جو انسانی جان کی حرمت کو تمام انسانیت کی حرمت سے مربوط کر رہا ہے، وہ امن عالم کو پامال کرنے کی اجازت پھر کیونکر دے سکتا ہے۔اس بارے ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ[8]

(وہ اس جان کو جسے اللہ تعالیٰ نے محترم قرار دیا ہے بغیر حق کے قتل نہیں کرتے۔)

انسانی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جب سے یہ دنیا آباد ہوئی ہے، اس وقت سے یہ جنگوں اور تنازعات کا شکار ہوتی آئی ہے۔انسانیت نے ہر دور میں جنگ کی تباہ کاریوں کا مشاہدہ کیا ہے۔دنیا میں کوئی قوم یا تمدن ایسا نہیں ہے جو تنازعات یا جنگ وجدل کا سامنا کرنے سے بچ پایا ہو۔یہ بات ایک حقیقت ہے کہ دنیا کے ہر مذہب میں جنگ، لڑائی یا جہاد کا تصور ملتا ہے لیکن اگر اس کے ضوابط و قواعد اس پر کسی قسم کی تحدید نہیں لگاتے تو ایسا تصور ناقابل عمل ہے۔اسلام ایک ایسا دین ہے جو جنگ اور جہاد کے تصور کو قانون وشریعت کی حدود اور اخلاق وکردار کی قوت سے مقید کرتا ہے۔یہ اس جذبے کو بے لگام یا شتر بے مہار نہیں چھوڑ دیتا کہ انسانیت سسک کر رہ جائے۔ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ لکھتے ہیں:

"اسلام کائنات کے حقائق سے فرار کی نہیں بلکہ وہ کائنات کے حقائق کے مکمل ادراک اور صحیح شعور کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام کی دعوت یہ ہے کہ ان حقائق کے شعور کو بہتر بنانے کے لیے مسلسل کوشش کی جاتی رہے۔ان حقائق کے ادراک میں ان قوتوں کا ادراک بھی شامل ہے جو شر کی علم بردار ہیں اور کائنات میں خیر کے خلاف کارفرما ہیں۔ خیر کے خیر ہونے کا تصور اس وقت تک ذہن میں نہیں آسکتا جب تک انسان شر کے تصور سے آشنا نہ ہو، اس لیے کہ اگر انسان شر کا ادراک نہ رکھتا ہو تو اس کو خیر کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔"[9]

اسلام میں جنگ کا حکم

اسلام نے جنگ کا حکم مدنی دور میں دیا۔اس سے قبل مکہ میں مسلمان کفار قریش کی تکالیف اور مصائب کو بڑی جاں سوزی سے برداشت کرتے رہے۔چونکہ مکہ میں مسلمان اقلیت میں تھے اور مدینہ ہجرت کے بعد ان کو ایک مستقل پناہ گاہ (دارالامن) مل گئی تھی۔اس لیے جب کفار مکہ ان کو مدینہ میں بھی زک پہنچانے کی کوششوں سے باز نہ آئے تو مسلمانوں کو جہاد

کی اجازت دے دی گئی۔ارشاد ہوا:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُواوَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ[10]

(جنگ کی اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن پر جنگ مسلط کی گئی ہے کیونکہ ان پر ظلم ہوا ہے،اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر قدرت رکھنے والا ہے۔)

یہ قتال کے متعلق اولین آیت ہے جو نازل ہوئی۔اس میں مسلمانوں کو اپنے دفاع کے لیے جنگ کی اجازت مرحمت فرمائی گئی۔اس کے بعد کئی آیات ایسی نازل ہوئیں جن میں اہل اسلام کو قتال کی ترغیب دی گئی۔ان آیات میں مختلف مواقع کے پیش نظر مختلف احکامات ارشاد فرمائے گئے۔

اسلام میں جنگ کے مقاصد

دنیا خیر وشر کی آماج گاہ رہی ہے۔اس خیر وشر کی لڑائی میں اسلام اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کو جہاد قرار دیتا ہے۔ محمود احمد غازیؒ لکھتے ہیں کہ جہاد بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں ہے بلکہ اصل مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے۔اسلام میں کچھ احکام ایسے ہوتے ہیں جو کسی اور حکم کی تکمیل یا وجود کا باعث بنتے ہیں۔اسی طرح جہاد فی نفسہ مطلوب نہیں ہے لیکن یہ ایک بڑے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔اسی لیے اس مقصد کے لیے یہ بھی مطلوب ہے۔فقہ کی اصطلاح میں جہاد کی حیثیت مقصود لعینہ کی نہیں بلکہ مقصود لغیرہ کی ہے۔[11]

ا۔حفاظت خود اختیاری

اسلام میں جنگ کے مقاصد میں سے اولین مقصد حفاظتِ خود اختیاری ہے۔انسانی جان کا احترام جس قدر اسلام نے کیا ہے اس کی مثال کسی اور دین ومذہب میں نہیں ملتی۔مقاصد شریعت میں انسانی بقاء اور حفظ جان کو اولیت حاصل ہے۔مسلمانوں کو بھی اولین جنگی احکام اس وقت دیے گئے جب ان کی بقاء اور زندگی داؤ پر لگ گئی تھی۔کفار مکہ کی مخالفت ان کو مدینے میں بھی چین سے نہ رہنے دے رہی تھی۔مدینہ پر اقدامی خطرہ بہت بڑھ گیا تھا۔ان حالات میں ان کو اجازت دی گئی کہ وہ اپنے دفاع کے لیے تیاری کر لیں۔ایسی صورت حال میں بین الاقوامی قانون کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اپنی بقاء، تحفظ اور سلامتی کے لیے جنگ کی جائے۔ مسلمانوں کی ابتدائی جنگیں دفاعی نوعیت کی تھیں جیسا کہ غزوہ بدر،احد اور خندق وغیرہ۔مسلمانوں نے ان جنگوں میں اپنی بقاء اور تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے دفاعی اقدام کیا۔اسلام کا مقصدِ جنگ توسیع پسندی نہیں ہے اور نہ ہی یہ کسی فرد کی ذاتی خواہش کے لیے ہوتی ہے۔بلکہ جب یہ مسلمانوں پر تھوپی جائے تو پھر بہر حال دفاع ضروری ہو جاتا ہے۔جمہور فقہاء کی یہ رائے ہے کہ قتال کی علت "کفر" یا "شوکت کفر" نہیں ہے بلکہ "محاربہ" یعنی جارحیت (Aggression) ہے۔[12] صحیح حدیث میں دشمن سے جنگ نہ کرنے کا ذکر آیا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دفاعی اقدام کے علاوہ صورتوں پر غور کر کے ہی جنگ کا ڈول ڈالا جانا چاہیے:

"لا تتمنوالقاء العدو، وسلواالله العافية۔فاذا لقيتموهم فاصبروا، واعلمواأن الجنة تحت ظلال السيوف۔"[13]

(دشمن سے مڈبھیڑ کی خواہش نہ کرو اور اللہ سے عافیت مانگتے رہو،پس جب میدان جنگ میں تمہارا سامنا ہو تو ثابت قدم رہو،صبر کرو اور جان رکھو کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔)

آپ ﷺ کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ جنگ وجدل اور تلوار اٹھائے بغیر اگر مقاصد حاصل ہو جائیں تو جنگ سے حتی

الوسع گریز کیا جائے۔ امام سرخسیؒ لکھتے ہیں:

"والمقصود أن يأ من المسلمون ويتمكن وامن القيام بمصالح دينهم ودنياهم۔"[14]

(مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کو امن وسکون میسر ہو اور وہ اپنے دینی اور دنیاوی مصالح (مقاصد) کی تکمیل کر سکیں۔)

اس تعریف کی رو سے درج ذیل تین مقاصد واضح ہوتے ہیں:

ا۔ مسلمان امن وسلامتی سے رہ سکیں۔

۲۔ ان کے دینی مصالح (مقاصد) پورے ہو رہے ہوں۔

۳۔ ان کے دنیاوی مصالح (مقاصد) بھی تکمیل کو پہنچ رہے ہوں۔

محمود احمد غازیؒ ان مقاصد کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"اگر یہ تینوں مقاصد جنگ کی نوبت آئے بغیر ہی پورے ہو جائیں تو جنگ کرنا ناجائز ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے ان تینوں میں سے کسی مقصد میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہو تو اس رکاوٹ کو دور کرنا اسلامی ریاست اور مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ پُرامن طریقے سے دور ہو تو پُرامن طریقے سے دور کریں اور اگر پُرامن ذرائع ناکام ہو جائیں تو تلوار اٹھائیں۔ اسی لیے جہاد کو فرض کفایہ قرار دیا گیا ہے، فرض عین نہیں۔"[15]

۲۔ اشاعت اسلام اور اقامت دین

جنگ یا جنگی کارروائی اس وقت بھی ضروری ہو جاتی ہے جب اشاعتِ اسلام اور اقامتِ دین کی راہ میں مشکلات پیدا کی جائیں۔ جہاد کا ایک اہم مقصد اسلامی دعوت کی اشاعت، تکمیل اور اس کے لیے اسباب مہیا کرنا ہے۔ اگر یہ اسباب موجود اور فراہم ہیں تو جنگ کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا16

(اور اللہ کا کلمہ ہی سربلند ہے۔)

دنیا میں اللہ کے دین اور اس کے کلمے کی سربلندی کے لیے جو بھی کوشش وکاوش ہو گی، وہ جہاد ہی ہو گی۔ اسی طرح اس کے دین کی اقامت اور شریعت کو قائم کرنے کے لیے جدوجہد جہاد اور جنگ کے ذیل میں ہی آئے گی۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا17

(اگر ایک گروہ دوسرے گروہ کے ذریعہ دور نہ کیا جاتا تو گرجے، خانقاہیں، ہیکل اور مساجد جن میں اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کیا جاتا ہے، ڈھا دی جاتیں۔)

۳۔ تحفظ دین

مقاصدِ شریعت میں تحفظِ دین بھی ایک اہم مقصد شمار کیا جاتا ہے۔ دین کے تحفظ کے لیے بھی جنگ جائز ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ18

(اگر ہم انسانوں کے ایک گروہ کا دوسرے گروہ سے خاتمہ نہ کرتے رہا کرتے تو زمین میں فساد برپا ہو جاتا۔)

مسلمانوں کی جنگیں صرف اپنے دین کے تحفظ اور آزادی کے لیے نہیں ہیں بلکہ وہ تمام مذاہب کے تحفظ اور آزادی کے لیے ہیں۔ان جنگوں کی غرض ان تمام مذاہب کی عبادت گاہوں کا تحفظ ہے۔عبادت گاہوں کا تحفظ مذہبی تحفظ پر دلالت کرتا ہے۔[19] کفار کا مسلمانوں پر جارحانہ اقدام کا ایک بڑا مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ انہیں ان کے دین سے ہٹادیں۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا20

(وہ تم سے جنگ کرتے رہا کریں گے یہاں تک کہ وہ تمہیں تمہارے دین سے لوٹا دیں اگر انہیں طاقت ہو۔)

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دین کے تحفظ اور دفاع میں جنگی اقدام ناگزیر صورت اختیار کرلیتا ہے۔محمود احمد غازیؒ لکھتے ہیں:

"اسلام نے جنگ کو اصولاً ایک ضرورت قرار دیا ہے۔اسلام نے اس نکتہ نظر کو قبول نہیں کیا کہ جنگ اصلاً ایک ناپسندیدہ چیز ہے۔اسلام کی نظر میں قوت ایک اچھی چیز ہے۔بشرطیکہ دینی اور اخلاقی حدود میں اس کا ستعمال ہو۔طاقت کا استعمال بالکل ٹھیک ہے۔اگر اخلاقی ضابطوں کے مطابق ہو،اور قوت وطاقت استعمال کرنے والے اخلاقی پابندیوں اور ان کے استعمال کی حدود وقیود سے واقف ہوں۔"[21]

۴۔فتنہ وفساد کا استیصال

اسلام میں جہاد وقتال کا ایک بڑا مقصد فتنہ وفساد کا خاتمہ اور استیصال بھی ہے۔اس بارے قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنِ انتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ22

(اور تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ وفساد باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے پھر اگر وہ باز آجائیں تو سوائے ظالموں کے ان پر دست درازی نہ کرو۔)

اسلام کا قانونِ جنگ استعماریت کی خاطر انسانی خون بہانے کے سخت خلاف ہے جیسا کہ ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ کئی طاقتور ممالک نے اپنے ادوار میں کمزور ممالک اور اقوام پر ملک گیری اور انانیت کی ہوس میں جارحیت کی۔اسی بارے فرمایا گیا:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا23

(اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعہ نہ ہٹاتا تو یقیناً راہبوں کی کوٹھڑیاں اور گرجے اور عبادت گاہیں اور مساجد جن میں اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کیا جاتا ہے، گرادی جاتیں۔)

اس آیت میں بھی جنگ کا مقصد زمین سے فتنہ وفساد کی بیخ کنی اور امن وامان کا قیام اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ مشروط کر کے بیان کیا گیا ہے۔فتنہ ایک ایسی چیز ہے جو زمین میں سخت خرابی کا باعث بنتا ہے،امن وامان کو تہ وبالا کر دیتا ہے۔انسانیت کو بدحال کر کے رکھ دیتا ہے۔اسی لیے قرآن مجید میں اسے قتل سے بھی زیادہ سخت قرار دیا گیا ہے:

وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ24

(اور فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔)

اس بنا پر فتنہ وفساد کے استیصال کا حکم دیا گیا ہے۔بصورت دیگر بڑا فساد پھیل جائے گا۔ارشاد ہوتا ہے:

إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ25

(اگر تم یہ کام نہ کرو گے تو ملک میں فتنہ برپا ہو جائے گا اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔)

فتنہ وفساد اندرونی لحاظ سے بھی ہو سکتا ہے اور بیرونی لحاظ سے بھی۔ ہر دو صورتوں میں اس کا تدارک ضروری ہے۔ اس کے لیے جو جنگ

کی جائے گی اسے 'جنگ مصالح' کا نام جاتا ہے۔ اگر اسلامی ریاست کے اندر سے کوئی گروہ یا جماعت ملی وحدت اور اسلامی نظام کو زک پہنچانا چاہتی ہے تو اس کے خلاف تلوار سے فیصلہ کیا جائے گا۔

۵۔ نقضِ عہد

'وفا بالعہود' اسلام کا ایک اہم اصول ہے۔ قرآن وسنت میں اس بارے میں واضح احکامات دیے گئے ہیں۔ اسی طرح معاہدات کی پابندی بھی اسلامی تعلیمات میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس بارے قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدتُّمْ وَلَا تَنقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا26

(اور جب معاہدہ کرو تو اللہ کے عہد کو پورا کرو اور قسموں کو پختہ کرنے کے بعد نہ توڑو۔)

اگر کوئی قوم نقضِ عہد کی مرتکب ہوتی ہے تو اس سے جنگ کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ کیونکہ معاہدات کو توڑنے سے امن وامان غارت ہو سکتا ہے۔ صرف نقضِ عہد کی ذمہ دار قوم سے ہی جنگ کا حکم دیا گیا ہے۔ سورہ انفال میں اس بارے میں تفصیلی احکام بیان ہوئے ہیں:

الَّذِينَ عَاهَدتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَo فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِم مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَo وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ27

(وہ جن سے آپؐ عہد کرتے ہیں تو پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں، وہ عہد کے توڑنے کے جرم سے نہیں بچتے۔ سو اگر تم ان کو جنگ میں پاؤ تو ان کو عبرت ناک سزا دے کر منتشر کرو تاکہ ان کی آئندہ نسلیں نصیحت حاصل کریں۔ اگر تجھے کسی قوم کی بدعہدی کا خوف ہو تو ان کا عہد برابری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی طرف پھینک دو۔ بے شک اللہ تعالیٰ عہد میں خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔)

ان آیات سے درج ذیل احکامات مستنبط کیے جا سکتے ہیں:

۱۔ نقضِ عہد ایک فوجداری جرم ہے۔

۲۔ جو لوگ بار بار عہد کو توڑتے ہیں، ان سے جنگ جائز ہے۔

۳۔ ان کو جنگ میں ایسی سزا دی جائے کہ ان کی آئندہ نسلیں بھی اس سے سبق حاصل کرتی رہیں۔

۴۔ معاہد قوم کی بدعہدی کا علم ہونے کے بعد ان کو معاہدے سے دستبرداری کا بتا کر اس سے الگ ہو جانا جائز ہے۔

۵۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام ایسی قوم کے ساتھ بھی خیانت کرنے کا حکم نہیں دیتا جو بار بار بدعہدی کی مرتکب ہوتی ہے۔ نقضِ عہد کی مرتکب قوم کی مثال ایسی عورت سے دی گئی ہے جو اپنا سوت کاتنے کے بعد تار تار کر دیتی ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِن بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَن تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ28

(اے معاہدہ توڑنے والو اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنا سوت کاتنے کے بعد تار تار کر دیتی ہے۔ تم اپنی قسموں کو

مکر وفریب کا ذریعہ نہ بناؤ تا کہ ایک قوم دوسری قوم سے نفع میں بڑھ جائے۔)

جو قومیں بار بار عہد کو توڑتی ہیں ان سے جنگ کا حکم صرف ان کے نقضِ عہد کے باعث دیا گیا ہے نہ کہ ان کے کفر وشرک کی بنا پر۔ جن لوگوں نے آپ ﷺ کے ساتھ اپنے معاہدات کو قائم رکھا، ان کی خلاف ورزی نہیں کی، ان سے جنگ کرنے سے روک دیا گیا۔ نقضِ عہد کی بنا پر جنگ کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا:

أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُم بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ[29]

(تم ان لوگوں سے کیوں جنگ نہیں کرتے جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑا اور رسول ﷺ کے نکالنے کا قصد کیا اور انہوں نے پہلے تمہارے ساتھ ابتداء کی۔)

آپ ﷺ نے ہجرت مدینہ کے کے بعد مدینہ کے اطراف کے قبائل، یہود اور کفار مکہ سے کئی معاہدے کیے۔ ان تمام معاہدات میں آپ ﷺ کی طرف سے کبھی کوئی پہلو تہی اختیار نہیں کی گئی۔ لیکن یہود اور کفار مکہ نے کئی بار ان سے سر موانحراف کیا۔ یہود نے جب مدینہ کے دفاع کے لیے نکلنے کی بجائے مشرکین مکہ کا ساتھ دیا اور آپ ﷺ سے کیے گئے معاہدہ (میثاق مدینہ) کی خلاف ورزی کی تو آپؐ نے ان پر فوج کشی کی اور مدینہ سے جلاوطن کر دیا گیا۔[30] اسی طرح صلح حدیبیہ کے بعد کفار مکہ نے اس کی عہد شکنی کی تو آپ ﷺ نے ان کے عہد کو واپس ان کی طرف پلٹا دیا اور اس معاہدہ شکنی کے نتیجے میں مکہ فتح ہوا۔ علامہ کاسانی نے تصریح کی ہے کہ نقضِ عہد دو طرح سے ہوتا ہے:

ا۔ صراحتہً: اس صورت میں فریقِ معاہدہ دوسرے فریقِ معاہدہ کو باخبر کر دیتا ہے کہ وہ خود کو معاہدے کا پابند تصور نہیں کرتا۔

۲۔ دلالتہً: اس صورت میں فریقِ معاہدہ کا رویہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ خود کو معاہدے کا پابند نہیں سمجھتا۔[31]

امام نوویؒ نے نقضِ عہد کی صورت میں درج ذیل تین امور بیان کیے ہیں:

ا۔ دار الاسلام پر حملہ

ب۔ حملہ آوروں کی مدد

ج۔ دار الاسلام کے کسی باشندے کی جان یا مال پر تعدی[32]

۶۔ مظلوموں کی دست گیری

مسلم اقلیتوں کے تحفظ کے لیے بھی جنگ اسلام میں جائز ہے۔ مظلوموں کی حمایت اور دست گیری کے بارے میں فرمایا گیا:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا[33]

(تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کہتے ہیں کہ اے خدا! ہمیں اس بستی سے نکال جہاں کے لوگ بڑے ظالم ہیں، اور ہمارے لیے خاص اپنی طرف سے ایک محافظ و مددگار مقرر فرما۔)

مولانا مودودیؒ اس بارے رقم طراز ہیں:

"ایسی جنگ کو جو ظالموں اور مفسدوں کے مقابلہ میں اپنی مدافعت اور کمزوروں، بے بسوں اور مظلوموں کی اعانت کے

لیے کی جائے، اللہ نے خاص راہِ خدا کی جنگ قرار دیا ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ جنگ بندوں کے لیے نہیں بلکہ خدا کے لیے ہے، اور بندوں کی اغراض کے لیے نہیں بلکہ خاص خدا کی خوشنودی کے لیے ہے۔ اس جنگ کو اس وقت تک جاری رکھنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک خدا کے بے گناہ بندوں پر نفسانی اغراض کے لیے دست درازی اور جبر و ظلم بند کرنے کا سلسلہ بند نہ ہو جائے۔"[34]

اگر کسی مسلم اقلیت پر ظلم روا رکھا جا رہا ہو اور اسلامی ریاست کا اس ریاست سے دوستی و امن کا کوئی معاہدہ نہیں ہے کہ جنگ کی وجہ سے اس معاہدے کے ٹوٹ جانے کا خطرہ ہو تو پھر اسلامی ریاست کا فریضہ ہے کہ وہ اس اقلیت کا تحفظ کرے اور ان کو آزادی دلائے۔ ایک اسلامی ریاست دوستی کا معاہدہ رکھنے والے غیر مسلموں کے تحفظ کی خاطر بھی جنگ کر سکتی ہے۔[35]

۷۔ قوت کا تدارک

اسلام کے مقاصد جنگ میں ایک مقصد دشمن کی قوت کا تدارک اور خاتمہ کرنا ہے۔ اس ضمن میں آپ ﷺ کا اسوہ یہ رہا کہ کم سے کم خون بہاتے ہوئے دشمن کی قوت کو توڑا اور ختم کیا جائے۔ آپ ﷺ اکثر کوشش فرماتے کہ جنگ سے گریز ہی کیا جائے اور جنگ کے بغیر ہی اپنے مقصد کو حاصل کیا جا سکے۔ محمود احمد غازیؒ لکھتے ہیں:

"جب جنگ کی نوبت آ جائے تو اس کا ہدف زیادہ سے زیادہ دشمن کا قتل عام نہ ہونا چاہیے بلکہ ہدف یہ ہونا چاہیے کہ کم سے کم خون بہایا جائے اور کم سے کم جانی نقصان کے ساتھ دشمن کی قوت کو توڑ دیا جائے، تاکہ جو قوتیں اسلام کے خلاف کھڑی ہوں وہ اسلام کے مقابلے کے لیے آئندہ پھر کھڑا ہونے کے قابل نہ رہیں اور اسلام کے راستے میں آگے چل کر پھر کوئی رکاوٹ پیدا نہ کریں۔"[36]

اسلام کے مقاصدِ جنگ میں یہ شامل نہیں ہے کہ انسانوں کی ایک بڑی تعداد یا پوری فوج کو ہی ختم کر دیا جائے۔ اصل غرض اور مقصد یہ ہے کہ دشمن کی قوت کا زور ٹوٹ جائے اور وہ آئندہ سے مسلمانوں اور اسلامی ریاست کے خلاف کسی قسم کے جارحانہ اقدام سے باز آ جائے۔ اس لیے یہ مقصد کچھ سربرآوردہ افراد یا کمانڈروں کے قتل سے بھی پورا ہو سکتا ہے یا دشمن کے اسلحہ کے ذخیرے کی تباہی سے بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ اسلام نے جنگ کو ناگزیر حالات میں جائز قرار دیا ہے۔ زیادہ تر جنگوں کی اجازت دفاع اور تحفظ دین کے لیے دی گئی ہے۔ بار بار نقضِ عہد کرنا اور زمین میں فتنہ و فساد پیدا کرنا بھی جنگ کے ذریعے انسداد پاتا ہے۔ اسی طرح مظلوم افراد کی جائز حدود میں حمایت و نصرت کرنے کے بھی احکامات دیے گئے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا قانون جنگ انسانیت کے لیے زندگی اور امن و سلامتی کا باعث ہے نہ کہ انسانیت کی تباہی و بربادی کی وجہ ہے جیسا کہ دیگر مذاہب میں جنگی قوانین اور ضوابط ملتے ہیں۔ تاریخ عالم میں جب بھی جنگیں لڑی گئیں ہیں تو بغیر کسی ضابطہ کی قیود اور اخلاقی حدود سے لڑی گئیں ہیں جنہوں نے کرہ ارض پر ہولناک مسائل کو جنم دیا ہے۔ اس کے برعکس اسلام کا فلسفہ جنگ امن و امان اور سلامتی و تحفظ کا پروانہ ضمانت ہے:

"الحروب هی عوارض عن حوادث الزمانکالامراض،کماان الأمن والسلامة صالحة للاجساد، فیجب حفظ الصحة بالامور السیاسة ودفع المرض بالامور الحربیة ولا شتغال یحفظ الصحة۔"[37]

(جنگیں بیماریوں کی طرح حوادثِ زمانہ کے ایسے ہی عوارض میں سے ہیں جیسے امن اور سلامتی جسموں کے لیے مفید ہے۔ پس ضروری ہے کہ صحت کا سیاسی امور سے تحفظ کیا جائے اور امراض کو جنگی امور سے دور کیا جائے کیونکہ اس سے صحت کی

حفاظت ہوتی ہے۔)

۸۔فریضہ دفاع

دفاع کا حق نہ صرف فطری ہے بلکہ یہ ایک شرعی فریضہ بھی قرار پاتا ہے۔اس لحاظ سے ایک مسلمان گروہ یا علاقے پر حملہ پوری امت مسلمہ پر حملہ تصور ہوگا۔فقہاء کے نزدیک اس علاقہ کے لوگ اس حملہ کا دفاع نہ کر سکیں تو ان کے مجاور علاقوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوگی۔اگر وہ بھی اس کے دفاع کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو یا اس سے پہلو تہی کریں تو ان کے بعد کے علاقوں پر یہ فرض عائد ہوگا۔اسی طرح یہ فریضہ پوری ملت اسلامیہ پر عائد ہوتا جائے گا۔

دفاع کا فریضہ اس قدر ناگریز ہے کہ ہر مسلمان کو اس میں شامل ہونا ضروری ہو جاتا ہے۔اگر دشمن اسلام اور اسلامی نظام کے درپے ہو اور اس کے خاتمے کے لیے مسلمانوں اور اہل اسلام پر حملہ آور ہو جائے تو تمام مسلمانوں پر یہ فرض عین ہو جاتا ہے کہ وہ مدافعت کے لیے میدان عمل میں نکل آئیں۔اس بارے قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَo وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُم مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّىٰ يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِن قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَo فَإِنِ انتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌo وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنِ انتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَo الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ[38]

(جو لوگ تم سے لڑتے ہیں،ان سے خدا کی راہ میں جنگ کرو مگر لڑنے میں حد سے تجاوز نہ کرو(یعنی ظلم پر نہ اترآؤ) کیونکہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ان ظالموں کو جہاں پاؤ قتل کرو،اور جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے وہاں سے انہیں نکال باہر کرو، کیونکہ یہ فتنہ قتل سے زیادہ بری چیز ہے۔پھر جب تک وہ تم سے مسجد حرام میں قتال نہ کریں تم بھی اس کے پاس ان سے قتال نہ کرو۔لیکن اگر وہ تم سے وہاں جنگ کریں تو تم بھی انہیں مارو اور کافروں کی یہی سزا ہے۔پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔تم ان سے برابر جنگ کیے جاؤ۔یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔پس اگر وہ باز آجائیں تو جان لو کہ سزا ظالموں کے سوا اور کسی کے لیے نہیں ہے۔ماہ حرام کا عوض ماہ حرام ہے اور تمام آداب اور حرمتوں کے بدلے ہیں۔پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے اس پر تم بھی اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے کی ہے مگر اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ صرف متقیوں کے ساتھ ہے۔)

مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ ان آیات سے حسب ذیل احکام نکلتے ہیں:

"ا۔جب مسلمانوں سے جنگ کی جائے اور ان پر ظلم وستم کیا جائے تو ان کے لیے مدافعت میں جنگ کرنا جائز ہے۔

۲۔جو لوگ مسلمانوں کے گھر بار چھینیں،ان کے حقوق سلب کریں،اور انہیں ان کی ملکیتوں سے بے دخل کریں،ان کے ساتھ مسلمانوں کو جنگ کرنی چاہیے۔

۳۔جب مسلمانوں پر ان کے مذہبی عقائد کے باعث تشدد کیا جائے اور انہیں محض اس لیے ستایا جائے کہ وہ مسلمان ہیں،تو ان کے لیے اپنی مذہبی آزادی کی خاطر جنگ کرنا جائز ہے۔

۴۔دشمن غلبہ کر کے جس سرزمین سے مسلمانوں کو نکال دے یا مسلمانوں کے اقتدار کو وہاں سے مٹادے اسے دوبارہ

حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اور جب کبھی مسلمانوں کو طاقت حاصل ہو تو انہیں تمام مقامات سے دشمن کو نکال دینا چاہیے جہاں سے اس نے مسلمانوں کو نکالا ہے۔"[39]

دفاع کی اس تیاری کا حکم قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّااسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ40

(ان کے مقابلہ کے لیے جس قدر تمہارے امکان میں ہو، سامان جنگ اور ہمیشہ تیار رہنے والے گھوڑے مہیا رکھو۔ اس سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے سوا ان دوسرے لوگوں کو جنہیں تم نہیں جانتے، مگر اللہ تعالیٰ جانتا ہے، مرعوب و خوفزدہ کر دو گے۔)

اس آیت کریمہ میں دفاع کے ضمن میں درج ذیل احکامات دیے گئے ہیں:

۱۔ دین کے دشمنوں جو درحقیقت اللہ تعالیٰ کے دشمن ہیں، سے بچنے کے لیے اپنی مکمل تیاری رکھو۔

۲۔ ایک مستقل فوج کی تیاری ایک لازمی امر ہے۔

۳۔ عصری تقاضوں کے مطابق ہتھیار اور اسلحہ اور اس سے متعلقہ ساز و سامان میسر ہونا چاہیے۔

۴۔ اس تیاری سے تم اپنے ان دیکھے دشمنوں پر بھی ہیبت طاری رکھو گے جس کے نتیجہ میں وہ تم پر دست درازی کی جرات نہ کر سکیں گے۔

علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

"اما اذاعم النفير بأن هجم العدو علىٰ بلد فهوفرض عين يفترض على كل واحد من آحاد المسلمين ممن هو قادرعليه...فاذاعم النفيرلايتحقق القيام به الابالكل،فبقى فرضاًعلى الكل عيناًبمنزلة الصوم والصلوة۔ فيخرج العبد بغير اذن مولاه،والمرءة بغيراذن زوجهالأن منافع العبد والمرءة فى حق العبادات المفروضة عينا مستثناه عن ملك المولى والزوج شرعا،كا فى الصوم والصلوة۔وكذاياح للولد أن يخرج بغير اذن الوالدين۔ لأن حق الوالدين لايظهرفى فروض الأعيان كالصوم والصلوة۔"[41]

(البتہ جب نفیر عام کی صورت ہو، مثلاً جب دشمن کسی علاقے پر حملہ کر دے تو جہاد فرض عین کی صورت میں ہر مسلمان فرد پر، جو اس کی مقدرت رکھتا ہو، لازم ہو جاتا ہے۔ پس نفیر عام کی صورت میں، جبکہ سب کے حصہ لیے بغیر فرض کی ادائیگی نہیں ہو سکتی، جہاد ہر فرد پر نماز اور روزے کی طرح فرض عین ہو جاتا ہے۔ پس ایسی صورت میں غلام اپنے آقا کی اجازت کے بغیر اور عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر فرض کی ادائیگی کے لیے نکلے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فروض اعیان کی صورت میں آقا اور شوہر کی ملکیت سے غلام اور بیوی کے منافع مستثنیٰ ہوتے ہیں، جیسے نماز اور روزے کا معاملہ ہے۔ اسی طرح بیٹے کو نکلنا ہو گا خواہ اس کے والدین نے اجازت نہ دی ہو کیونکہ والدین کی اجازت فروض اعیان کی صورت میں مؤثر نہیں ہوتی، جیسے نماز اور روزے کے متعلق حکم ہے۔)

اسلام کے قواعدِ جنگ

جنگ کی تاریخ پر اگر نظر دوڑائی جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے سوا دنیا کے کسی مذہب، دین یا قوم میں جنگ

سے متعلقہ باقاعدہ

احکام اور ہدایات موجود نہیں ہیں۔اس لیے جب ان ادیان ومذاہب کے ماننے والے جنگ کی رزم گاہوں میں پہنچتے ہیں تووہ خود اپنے دین کے احکامات کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور ان کے اخلاقی ضابطے صرف ان کی عبادت گاہوں تک ہی محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ہر دور میں انسان نے اپنے محدود گروہ کے مفادات کے لیے قتل وغارت گری کو اختیار کیا ہے۔اس سے بچاؤصرف اسی صورت میں ممکن ہے جب تک انسانوں کے مفاد کو کسی محکم اور پائیدار اخلاقی اصول وضوابط کے ماتحت نہ کر دیا جائے۔بصورت دیگر جنگ کی تباہ کاریاں کرہ ارض پر اپنے گل کھلاتی رہیں گی۔اسلام جنگ کی خواہش یا حوصلہ افزائی نہیں کرتا بلکہ اسے شدید مجبوری اور اضطرار کی حالت میں قبول کرتا ہے۔اگر پرامن ذرائع اور صلح صفائی سے مسئلہ حل ہو سکتا ہے تو شریعت نے اسے ہی اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

ا۔انسانیت کے تقاضوں کی پابندی

احترام انسانیت اسلام کا طرہ امتیاز ہے۔اسی لیے دوران جنگ انسانیت کے تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھنے کے احکامات مرحمت فرمائے گئے ہیں۔اسلام میں جنگ کا نظریہ مقابل کو قتل کرنا اور غارت گری نہیں بلکہ حریف کے شر کو دفع کرنا ہے۔جہاد فی سبیل اللہ کی اصطلاح اسے دیگر عام جنگوں سے ممیّز وممتاز کر دیتی ہے۔اسلام میں اپنے دفاع کا حق دیا گیا ہے اور اس حق کو کچھ قیود وضوابط کا پابند بنایا گیا ہے۔اس میں سرفہرست "حد سے تجاوز نہ کرنا" ہے۔قرآن کریم اور احادیث نبویہ ﷺ اس پر دلالت کرتی ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِۦ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّٰبِرِينَ[42]

(اور اگر تمہیں بدلہ ہی لینا ہے تو اتنا ہی بدلہ لو جتنی تم پر زیادتی کی گئی ہے۔اور اگر تم نے صبر کی روش اختیار کی تو یہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔)

مسلمانوں کو اتنا ہی بدلہ لینے کا حکم دیا گیا ہے جتنا کہ ان پر ظلم کیا جائے۔فرمایا گیا:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ[43]

(اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔)

لڑائی شروع کرنے سے پہلے اسلام کی دعوت و تبلیغ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا:

"لاتقاتلهم حتى تدعوم هم۔فأن ابوا فلا تقاتلوهم حتى بيدؤكم۔فان بدؤكم فلا تقاتلوهم حتى يقتلوا منكم قتيلا۔ثم اروهم ذلک القتيل وقولولهم:هل الى خيرمن هذا سبيل؟فلان يهدى الله تعالى على يديک خير لک مما طلعت عليه الشمس وغربت۔"[44]

(ان سے جنگ نہ کرو جب تک کہ ان کو دعوت نہ دو۔اگر انہوں نے دعوت کی قبولیت سے انکار کیا تو ان سے جنگ نہ کرو جب تک کہ وہ شروع نہ کریں۔پھر اگر وہ جنگ شروع کریں تو ان سے نہ لڑو یہاں تک کہ وہ تم میں سے کسی کو قتل کر لیں۔پھر انہیں مقتول کی لاش دکھا کر کہو! کیا اس سے بہتر کی طرف کوئی راہ نکل سکتی ہے؟پس اگر اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعے کسی کو ہدایت نصیب کرے تو یہ تمہارے لیے اس سب کچھ سے بہتر ہے جس پر سورج طلوع اور غروب ہوا۔)

۲۔غیر مقاتلین کے قتل کی ممانعت

اسلامی شریعت میں محاربین کو دو طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے:۔

ا۔اہل قتال ب۔غیر مقاتلین

اہل قتال یا مقاتلین وہ لوگ ہوتے ہیں جو عملاً جنگ میں شریک ہوں یا جنگ میں حصہ لینے کی طاقت و قوت رکھتے ہوں۔جبکہ غیر مقاتلین میں ایسے افراد شامل ہیں جو کہ جنگ میں شرکت سے معذور ہوں یا جنگ میں کسی بھی لحاظ سے شریک نہ ہوں۔اسلام میں ایسے لوگوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔جن میں عورتیں، بچے، بوڑھے، زخمی، بیمار، معذور، مذہبی پیشوا، مجاور، خانقاہ نشیں وغیرہ شامل ہوں۔ صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے:

"ان رسول اللہ ﷺ قال: انطلقوا باسم اللہ وباللہ وعلی ملة رسول اللہ ﷺ،ولاتقتلواشیخاً فانیا ولا طفلاً ولا صغیراولاامرأة، ولا تغلوا،وضموا غنائمکم واصلحواواحسنواان اللہ یحب المحسنین۔"[45]

(رسول اللہ ﷺ نے فوج روانہ کرتے وقت فرمایا اللہ کا نام لے کر اللہ کی مدد سے اور اللہ کے رسول ﷺ کی ملت پر قائم رہتے ہوئے چل پڑو۔کسی بوڑھے، ضعیف، چھوٹے بچے اور عورت کو قتل نہ کرنا، مال غنیمت میں چوری نہ کرنا، جنگ میں جو کچھ ہاتھ آئے ایک جگہ جمع کرنا، صلح کی روش اختیار کرنا اور احسان کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔)

فقہاء نے اس بارے میں بیان کیا ہے کہ محاربین میں سے صرف انہیں کو قتل کرنا جائز ہے جو مسلمانوں کو جانی نقصان پہنچانے کا باعث بن سکتے ہوں:

"المقاتلة من له بنیه صالحة للقتال۔"[46]

(انہی کو دورانِ جنگ قتل کیا جانا چاہیے جو لڑائی کی زیادہ جسمانی اہلیت رکھتے ہوں۔)

۳۔مثلہ کی ممانعت

قبل از اسلام جنگوں میں دشمن کے ساتھ بڑا اہانت آمیز سلوک کیا جاتا تھا۔خصوصاً اہل عرب مخالفین کو قتل کرنے کے بعد ان کے اعضاء کی قطع و برید کرتے تھے جسے عرف عام میں "مثلہ" کہا جاتا ہے۔اس کی واضح مثال غزوہ احد میں رسول اکرم ﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ کی لاش کا ابوسفیان کی بیوی ہندہ کی طرف سے ایسے فعل کا ارتکاب کرنا تھا۔[47] رسول اللہ ﷺ نے مثلہ کرنے کی سختی سے ممانعت فرمائی۔حدیث میں وارد ہے:

"قاتلوامن کفر باللہ، ولا تغلوا، ولا تغدروا، ولا تقتلوا ولیداً۔"[48]

(ان سے لڑو جنہوں نے اللہ کا کفر کیا۔خیانت نہ کرو، عہد شکنی نہ کرو، لاشوں کی بے حرمتی نہ کرو، اور بچوں کو قتل نہ کرو۔)

اسی طرح میں محدثین اور فقہاء نے قتل کے دیگر ممنوعہ طریقوں کو بھی بیان کیا ہے جیسا کہ آگ سے جلانا، سر کاٹ کر دوسروں کو بھیجنا یا نمائش کرنا، باندھ کر مارنا وغیرہ اس میں شامل ہیں۔آپ ﷺ نے آگ کے عذاب سے بھی منع فرمایا ہے۔

۴۔لوٹ مار، تباہی اور قتل سفیر کی ممانعت

قرآن کریم میں فسادی حاکم کے بارے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ49

(جب وہ حاکم بنتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد پھیلائے اور فصلوں اور نسلوں کو برباد کرے، مگر اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔)

رسول اکرم ﷺ نے لوٹ مار، تباہی اور بربادی سے منع فرمایا۔ صحیح حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ سفر جہاد میں اہلِ لشکر نے چند بکریاں لوٹ لیں اور ان کا گوشت دیگچیوں میں پکنے کے لیے چڑھا دیا۔جب آپ ﷺ کو اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے لوٹے گئے گوشت کی ان دیگچیوں کو الٹ دیا اور فرمایا:

"ان النهبة ليست باحل عن الميتة۔"[50]

(لوٹ کا مال مردار سے بہتر نہیں ہے۔)

حدیث حسن میں آیا ہے:

"من ضيق منزلاً أوقطع طريقاً فلا جهاد له۔"[51]

(جس نے منزل کو تنگ کیا یا راہ گیروں کو لوٹا تو اس کا جہاد نہیں ہوا۔)

سفراء اور قاصدوں کی حفاظت بھی رسول اللہ ﷺ کے فرمودات اور اسوہ سے ثابت ہوتی ہے۔آپ ﷺ نے ان کے ساتھ اچھے سلوک کا حکم دیا۔ان کو مارنے اور قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے۔خاص طور پر جب مسیلمہ کذاب کے قاصد آپ ﷺ کے پاس اس کا پیغام لے کر آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا:۔

"اما واللہ لولا ان الرسل لاتقتل لضربت اعناقکما۔"[52]

(اللہ کی قسم! اگر قاصدوں کا قتل ممنوع نہ ہوتا تو میں تمہاری گردن الگ کر دیتا۔)

آپ ﷺ نے جب شرحبیل بن عمرو الغسانی کے پاس اپنے سفیر حضرت حارث بن عمرو ازدیؓ کو بھیجا تو اس نے آپؐ کو قتل کروا دیا۔اس پر آپ ﷺ نے ان کا بدلہ لینے کے لیے ایک لشکر روانہ فرمایا۔جس کے نتیجہ میں جنگ مُوتہ ہوئی۔[53]

۵۔بدعہدی کی ممانعت

جنگوں کے وقوع کی ایک بڑی وجہ بدعہدی ہوتا ہے۔اس لیے اسلامی شریعت میں بدعہدی کو سختی سے ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔تاہم اگر معاہد قوم یا ریاست کسی عہد کی خلاف ورزی کی مرتکب ہو تو پھر حالات میں تبدیلی آجاتی ہے اور جنگ اور حملہ کا جواز قائم ہو جاتا ہے۔قرآن پاک میں ارشاد ہے:

وَ إِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ54

(اگر تمہیں کسی قوم کی ضمانت کا خوف ہو تو ان کا معاہدہ برابری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی طرف پھینک دے۔)

غزوہ خندق کے موقع پر بنو قریظہ کے متعلق اطلاع ملی کہ وہ معاہدہ توڑنا چاہتے ہیں تو آپ ﷺ نے اس بات کی تصدیق کے لیے اپنے سفیر کو روانہ کیا۔تصدیق پر آپ ﷺ نے ان کی سرکوبی کے لیے ان کا محاصرہ کر لیا اور اس امر کا کوئی پیغام ان کو نہیں بھیجا۔[55] اسی طرح جب اہل مکہ نے صلح حدیبیہ کا عہد توڑ دیا اور بنو خزاعہ پر حملہ آور ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے ایک وفد ان کے پاس بھیجا۔جس نے ان کے سامنے تین شرائط پیش کیں۔انہوں نے صلح حدیبیہ کو ختم کرنے کی بات پر صاد کیا تو آپ ﷺ نے اہل مکہ پر چڑھائی کی۔[56] جامع ترمذی صحیح حدیث میں مروی ہے:

"سمعت رسول اللہ ﷺ من کان بینه وبین قوم عهد فلا یحلن عقده حتی ینقضی امرها أوینبذ الیهم علی سواء۔"[57]

(میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو وہ اس وقت تک معاہدے کا بند نہ کھولے جب تک اس کی مدت پوری نہ ہو جائے یا وہ برابری کا لحاظ کر کے اس قوم کی طرف پھینک دے۔)

صلح حدیبیہ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو مسلمان مکہ سے مدینہ آئے گا، آپ ﷺ اسے واپس لوٹانے کے پابند ہوں گے۔ ابھی معاہدہ لکھا نہیں گیا تھا کہ سفیر قریش کے بیٹے ابو جندلؓ اہل مکہ کی قید سے جان چھڑا کر مسلمانوں کے پاس پہنچ گئے۔ چونکہ معاہدہ کی شرائط طے ہو چکی تھیں اس لیے آپ ﷺ نے معاہدہ کی پاس داری فرماتے ہوئے انہیں قریش کو واپس لوٹا دیا۔[58]

۶۔ اذنِ امام کی شرط

جہاد کی کئی شرائط ہیں جن کی موجودگی میں ہی یہ فرض ہوتا ہے۔ بصورت دیگر ان شرائط کے مفقود ہونے سے اس کی فرضیت بھی ساقط ہو جائے گی۔ اس میں ایک بڑی شرط "اذن امام" کی ہے۔ یہ ایک بنیادی شرط ہے کہ جہاد حکومت اور اجتماعی نظم کے تحت رہ کر ہی کیا جا

سکتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"وانما الامام جنة یقاتل من ورائه ویتقیٰ به"[59]

(امام ڈھال ہے جس کے پیچھے رہ کر جنگ کی جاتی ہے اور جس کے ذریعے اپنا بچاؤ کیا جاتا ہے۔)

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ امیر کی اطاعت ایک طرح سے آپ ﷺ کی اطاعت ہی ہے۔ جب امیر جہاد کا حکم دے گا تو اس کے لیے مسلمانوں کو نکلنا ہوگا۔ جہاد کے لیے امام اور حاکم کی امارت ضروری قرار دی گئی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں بیان ہوا ہے:

"الجهاد واجب مع کل امیر براً أو فاجراً۔"[60]

(جہاد ہر امیر کی معیت میں، خواہ نیک ہو یا بد، واجب ہے۔)

اس حدیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آئندہ ہر طرح کے حکمران آئیں گے۔ ان میں اچھے بھی ہوں گے اور برے بھی، جہاد ان سب کی سربراہی میں ہی ہوگا۔ ان روایات سے استدلال کرتے ہوئے فقہاء نے یہ قرار دیا ہے کہ جہاد صرف حکمران یا اس کے نائب کی امارت واطاعت میں ہی کیا جائے گا۔ امام ابو یوسفؒ اس بارے میں لکھتے ہیں:

"لا تسری سریة الا باذن الامام أومن یولیه علی الجیش، ولا یحمل رجل من عسکر المسلمین علی رجل من المشرکین ولا یبارزه الا باذن امیر الجیش۔"[61]

(کوئی جنگی کارروائی امام یا اس کے نائب کی اجازت کے بغیر نہیں کی جائے گی، نہ ہی مسلمانوں کے لشکر سے کوئی شخص امیر کی اجازت کے بغیر مشرکین کے کسی شخص پر حملہ یا اس کے ساتھ مبارزت کرے گا۔)

۷۔ جنگی چال

جنگ کے دوران ایک اور چیز نہایت اہم ہے اور وہ ہے کسی مقصد کے حصول کے لیے کسی جنگی چال کا چلنا جیسا کہ ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَo وَمَن يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ62

(اے ایمان والو! جب میدان جنگ میں کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا اور جو شخص جنگ کے روز اس صورت کے سوا کہ لڑائی کے لیے کنارے کنارے چلے یا اپنی فوج میں جا ملنا چاہے، ان سے پیٹھ پھیرے گا (تو سمجھو کہ) وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔)

اسی طرح صحیح حدیث میں آیا ہے:

"الحرب خدعة۔"[63]

(جنگ چالبازی کا نام ہے۔)

جنگی داؤ پیچ کا استعمال ہر دور میں جنگی حکمت عملیوں کے تحت کیا جاتا رہا ہے۔ اسلام میں بھی اس کی اجازت ہے۔ تاہم ایسی جنگی چالبازی جو صریحاً بدعہدی، دھوکہ اور جھوٹ پر دلالت کرتی ہو، ناجائز اور غلط قرار دی گئی ہے۔ یہاں پر جنگی چال سے مراد ایسی اصطلاح ہے جو جنگی حکمت عملی کی تکمیل کے لیے کی جائے۔ جیسا کہ غزوہ خندق میں نو مسلم صحابی حضرت نعیم بن مسعودؓ نے نبی اکرم ﷺ کی اجازت سے بنی قریظہ اور قریش مکہ کے سرداروں کو دو مختلف تجاویز اور مشورے دیے۔[64] جنگ میں اس طرح کے اقدام کی اجازت دی گئی ہے۔ امام سرخسیؒ رقم طراز ہیں:

"وكان من الخدعة ان يقول لاصحابه قولاً ليرى من سمعه ان فيه ظفراً، أوأن فيه أمراً يقوى أصحابه وليس الأمركذلک حقيقة، ولكن يتكلم على وجه لايكون فيه كاذباً فيه ظاهراً۔"[65]

(خدعہ کی ایک مثال یہ ہے کہ امیر اپنے ساتھیوں سے ایسی بات کہے جس سے سننے والے کو یہ تاثر ملتا ہو کہ اس میں انہیں کامیابی نصیب ہو گی، یا اس میں کچھ ایسی بات ہے جس سے اس کے ساتھیوں کو تقویت ملے گی، حالانکہ درحقیقت ایسا نہ ہو، لیکن شرط یہ ہے کہ ایسی بات وہ اس طرح کہے کہ اس میں اسے ظاہری طور پر جھوٹ نہ بولنا پڑے۔)

۸۔ جنگی قیدیوں کا مسئلہ

قبل از اسلام جنگی قیدیوں سے جو انسانیت سوز سلوک روا رکھا جاتا تھا، وہ ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ اسلام عالم انسانیت کے لیے امن اور رحمت کا پیغام لے کر آیا۔ اس نے زمانہ جاہلیت کی وہ تمام مکروہ اور انسانیت سوز رسوم ناجائز قرار دے دیں جو اسیرانِ جنگ کے حقوق کو پامال کر رہی تھیں۔ سورہ محمد میں اسیرانِ جنگ سے متعلق حکم دیا گیا:

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا66

(پس جب کافروں سے مٹھ بھیڑ ہو تو ان کی گردنیں مارنی ہیں۔ یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو تب قیدیوں کو مضبوط باندھو۔ اس کے بعد چاہے احسان کر کے رہا کر دو یا فدیہ لے کر، یہاں تک کہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے۔)

فقہاء نے جنگ میں قید ہونے والے لوگوں کو دو اقسام میں تقسیم کیا ہے:

ا۔اِسری: یہ ایسے قیدی ہوتے ہیں جو براہ راست مقاتلین کی صف میں آتے ہیں۔

ب۔ سبی: غیر مقاتلین قیدیوں کو "سبی" کہا جاتا ہے۔[67]

اسلام میں جنگی قیدیوں کو قتل نہیں کیا جاسکتا سوائے اس سے کہ ان سے کوئی سنگین جرم سرزد ہوا ہو۔اس بات پر صحابہ کرامؓ کا اجماع تھا۔[68]امام سرخسیؒ لکھتے ہیں:

"المقاتلة من له بنيه صالحة للقتال۔"[69]

(انہی کو دوران جنگ قتل کیا جانا چاہیے جو لڑائی کی زیادہ جسمانی اہلیت رکھتے ہوں۔)

عام حکم یہی ہے کہ ان پر احسان کیا جائے یا پھر فدیہ کا معاملہ کیا جائے۔احسان کی صورت درج ذیل نوعیت کی ہو سکتی ہے:

ا۔قید کی حالت میں اچھا سلوک کرنا۔ ب۔بغیر فدیہ کے رہا کر دیا جائے۔ ج۔ذمی بنالیا جائے۔

آخری صورت کی مثالیں ہمیں عہد خلافت میں ملتی ہیں۔جب حضرت عمر فاروقؓ نے بلادِ عراق کے لوگوں کو ذمی قرار دیا تھا۔رسول اکرم ﷺ نے خیبر کی فتح کے بعد وہاں کے لوگوں کو ذمی قرار دیا تھا۔[70] فدیہ کی بھی تین صورتیں ہو سکتی ہیں:

ا۔مالی معاوضہ ب۔رہائی کی صورت میں کوئی خدمت لینا ج۔اپنے قیدیوں کی رہائی کے بدلے میں قیدیوں کا تبادلہ کرنا

اسلامی عہد میں ان سب پر عمل کیا گیا ہے۔ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کے پاس مشرکین کے قیدی ہوتے اور مشرکین کے پاس مسلمانوں کے قیدی ہوتے اور اپنے اپنے قیدیوں کو چھڑانے پر اتفاق ہو جاتا تو اس کا بندوبست کیا جاتا تھا۔[71]سنت رسول ﷺ سے بھی ہمیں قیدیوں کے تبادلے کی مختلف مثالیں ملتی ہیں۔اسی بنا پر جمہور فقہاء نے اس بات پر اتفاق کیا کہ اگر دشمن مسلمان اسیروں سے اپنے اسیروں کا تبادلہ کرنے پر راضی ہو تو تبادلہ کیا جانا چاہیے۔[72] بعض استثنائی صورتیں ایسی بھی ہیں جن میں جنگی قیدیوں کو قتل کرنے کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ایسا صرف اسی وقت ہی ہوتا تھا جب کسی خاص قیدی سے اسلامی مفادات کو خطرات محسوس ہوتے تھے یا جو کسی شدید جرم میں ملوث پایا جاتا تھا۔اس طرح کا حق صرف حکومت ہی کو حاصل ہے۔افراد کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اسیر انِ جنگ کو ہلاک کریں۔آپ ﷺ کا عام طریق کار جنگی قیدیوں کا قتل کا نہ تھا۔خلفائے راشدینؓ کے عہد میں بھی یہی طرز عمل اختیار کیا گیا۔جنگی قیدیوں کے لیے ایک موقع فراہم کیا جاتا تھا کہ وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر اسلام کی حقانیت کا جائزہ لے سکیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّمَن فِي أَيْدِيكُم مِّنَ الْأَسْرَىٰ إِن يَعْلَمِ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّا أُخِذَ مِنكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ[73]

(اے نبی! تمہارے قبضے میں جو قیدی ہیں ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں کوئی بھلائی پائے گا تو جو تم سے لیا گیا ہے اس سے بہتر تم کو وہ عطا فرمائے گا اور تم کو بخش دے گا، اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔)

۹۔مالِ غنیمت

جنگ کے بعد دشمن سے ملنے والا تمام منقولہ و غیر منقولہ ساز و سامان مال غنیمت میں آتا ہے۔اسلامی فقہ نے غنائم کے

متعلق تفصیلی ہدایات دی ہیں۔ قبل از اسلام اس ضمن میں کوئی باقاعدہ ضابطہ اور طریقہ کار موجود نہیں تھا۔اسی لیے فاتح لشکر سب کچھ لوٹ لیتا تھااور بادشاہ اپنے لیے بہت کچھ مخصوص کر لیتے تھے۔اہلِ عرب بھی جنگی خدمات کے وقت غنائم کو دیکھ کر ضبط کا یارا چھوڑ دیتے تھے۔ سید مودودیؒ اس بارے میں لکھتے ہیں:

"غنیمت کا شوق ایک فطری جذبہ تھا جو صدیوں کی روایات سے طبیعتوں میں اس قدر راسخ ہو گیا تھا کہ کسی انسانی جماعت حتیٰ کہ صحابہ کرامؓ جیسی مقدس اور متاعِ دنیا کو حقیر جاننے والی جماعت کے لیے بھی اس کے اثرات کو دفعتہً دل ودماغ سے محو کر دینا غیر ممکن تھا۔جب حال یہ تھا تو ایک حکیمانہ مذہب جو فطرت سے جنگ نہیں بلکہ اس کی اصلاح کرنا چاہتا تھا، اس سے بہتر طریقہ اور کیا اختیار کر سکتا تھا کہ نفس غنیمت کو حلال کر دیتا اور بالواسطہ طریقوں سے اس کے شوق کو گھٹانے اور اس کے حدود کو کم کرنے کی کوشش کرتا، یہی راستہ تھا جو اسلام نے اختیار کیا۔"[74]

اسلام نے دشمن سے جو مال غنیمت حاصل ہو گا،اس کی تقسیم کے لیے واضح حکم دیا ہے۔قرآن کریم میں اس بارے میں فرمایا گیا:

وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ75

(جان لو جو مالِ غنیمت تم کو حاصل ہو اس کا پانچواں حصہ اللہ،اس کے رسولؐ،اہلِ قرابت ،یتامیٰ ومساکین اور مسافروں کا ہے۔)

اس آیت کی رو سے مال غنیمت حکومت اور فوج کا مشترکہ حصہ ہوتا ہے۔ پانچواں حصہ بیت المال کے لیے نکال کر باقی ۴/۵ حصہ فوج میں تقسیم کیا جائے گا۔اسی طرح وہ مال جو بغیر لڑے حاصل ہو "فے" کہلاتا ہے۔یہ سارا مال حکومت کے بیت المال میں جمع ہو گا اور اس کا استعمال حکمران کی صوابدید پر ہو گا۔[76]اسلام نے مال غنیمت کو چھپانے اور غلول کرنے کی سختی سے ممانعت کی ہے اور اسے حرام قرار دیا ہے:

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَغُلَّ ۚ وَمَن يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ77

(جو کوئی مال غنیمت میں خیانت کا مرتکب ہو گا، وہ جو کچھ اس نے خیانت کی ہے قیامت کے دن لائے گا۔)

خلاصہ بحث

درج بالا بحث سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت نے نہ صرف مقاصدِ جنگ بلکہ طریقِ جنگ کی بھی تطہیر کی ہے۔اس نے جنگ کا کوئی نہ کوئی مقصد متعین اور طے کیا ہے کہ یہ اعلائے کلمۃ اللہ،احترام انسانیت، مظلوموں کی دست گیری، فتنہ و فساد کے خاتمہ اور امن وامان کا قیام کے لیے ہی ہو سکتی ہے۔اس طرح ان تمام وحشیانہ اور انسانیت سوز طریقوں کو یکسر موقوف قرار دیا گیا جو کہ قبل از اسلام دنیا بھر میں رائج تھے۔ نیز جنگ کو اخلاقی اصولوں کے ساتھ مقید کر دیا۔ سترھویں صدی کی ابتداء تک یورپ قوانینِ جنگ کے تصور تک سے بالکل خالی الذہن تھا۔اصولاً اور عملاً جنگ کو اخلاقی حدود اور قواعد وضوابط کی پابندیوں سے مستثنیٰ سمجھا جاتا تھااور محاربین کو ایک دوسرے کی ضرر رسانی کا مطلق اور غیر محدود حق حاصل تھا۔لاتعداد جنگوں کے تجربہ سے یہ سبق حاصل ہو جانا چاہیے تھا کہ بے مقصد جنگ صرف تباہی اور بربادی لاتی ہے۔ نسل انسانی کے مفاد کا یہ تقاضا تھا کہ بعد از جنگ امن وخوش حالی کا ایک طویل دور موجود ہو جو زخموں کا مداوا کر سکے۔ اسلام کے یہ وہ احکام

ہیں جو قرآن میں دشمن ممالک، غیر جانبدار ممالک اور دوست ممالک کے ساتھ تعلقات رکھنے کے متعلق اللہ تعالیٰ نے صادر فرمائے اور جن پر حضور اقدس ﷺ نے عمل کے ذریعہ عالم انسانی کے لیے نشان دہی فرمائی ہے کہ ان قوانین پر کس طرح عمل کیا جائے۔عہد و پیمان کی پابندی، جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک، دشمن کے مقتولین کی تدفین،جب دشمن ہتھیار ڈال دے تو اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائےاور جب دشمن صلح کی طرف رغبت دکھائے تو کس سرعت سے ہتھیار ایک طرف رکھ دیے جائیں،یہ اور اس طرح کی میدان جنگ سے متعلق دوسری ہدایات ایسے روشن چراغ ہیں جن سے ہدایت حاصل کیے بغیر اگر جنگ لڑی جائے تو انسانوں اور حیوانوں کی کشمکش میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا ہے۔اسلام نے ساتویں صدی عیسوی میں ہی وہ ضابطہ اخلاق دے دیا جو یورپ کو سترھویں صدی عیسوی میں "بین الاقوامی قانون" کی شکل میں سمجھ میں آیا۔

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.

حواشی و حوالہ جات

[1]۔محمد مشتاق احمد،ڈاکٹر،جہاد،مزاحمت اور بغاوت(اسلامی شریعت اور بین الاقوامی قانون کی روشنی میں)الشریعہ اکادمی ،گوجرانوالہ،۲۰۱۶ء،ص۲۱۴-۲۱۵

[2]۔العنکبوت۲۹:۶۹

[3]۔الحج۷۸:۲۲

[4]۔البھوتی،منصور بن یونس بن صلاح الدین،کشاف القناع عن متن الاقناع،دار الفکر القاھرۃ،۱۹۶۸ء،۳۶/۳

[5]۔الکاسانی،علاؤالدین ابو بکر بن سعود،بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع،مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ،سن ندارد،۹۷/۷

[6]۔التوبہ۹:۱۲۲

[7]۔المائدہ۵:۳۲

[8]۔الفرقان۲۵:۶۸

[9]۔غازی،محمود احمد،ڈاکٹر،اسلام کا قانون بین الممالک،شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد،۲۰۱۴ء،ص۳۶۱

[10]۔الحج۲۲:۳۹

[11]۔اسلام کا قانون بین الممالک،ص۲۶۲-۲۶۳

[12]۔ابوالولید ،محمد بن احمد ابن رشد،بدایۃ المجتھد و نھایۃ المقتصد،مکتبہ مصطفیٰ باز الریاض،۱۹۹۵ء،۱/۳۷۱؛التنوخی،سحنون

عبدالسلام بن سعید بن حبیب، المدونۃ الکبریٰ، دارالباز القاھرۃ، ۱۳۲۳ھ، ۱۶/۳؛الحرانی، تقی الدین احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیہ، قاعدۃ مختصر فی قتال الکفار ومھادنتھم و تحریم قتلھم لمجرد کفرھم، (تحقیق: الدکتور عبدالعزیز بن عبداللہ بن ابراہیم الزیر آل احمد) الریاض، ۱۴۲۴ھ، ص ۱۱۶

[13]۔البخاری، ابوعبداللہ، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح المسند المختصر من اِمور رسول اللہ ﷺ وسننہ وایامہ، دارالسلام لوئر مال لاہور، ۱۴۳۳ھ، کتاب الجھاد والسیر، باب: لاتمنوالقاء العدو، حدیث رقم: ۳۰۲۵؛ابوداؤد، کتاب الجھاد، باب: فی کراھیۃ تمنی لقاء العدو، حدیث رقم: ۲۶۳۱

[14]۔السرخسی، اِبو بکر محمد بن احمد بن اِبی سہل، المبسوط (تحقیق: الدکتور حسن اسماعیل الشافعی) دارالکتب العلمیۃ بیروت، ۱۹۹۷ء، کتاب السیر، ۱۰/۴

[15]۔اسلام کا قانون بین الممالک، ص ۳۳۷

[16]۔التوبہ ۹:۴۰

[17]۔الحج ۲۲:۴۰

[18]۔البقرہ ۲:۲۵۱

[19]۔چیمہ، غلام رسول، اسلام کا سیاسی نظام، علم و عرفان پبلشرز اردو بازار لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۳۲۵

[20]۔البقرہ ۲:۲۱۷

[21]۔اسلام کا قانون بین الممالک، ص ۳۶۴

[22]۔البقرہ ۲:۱۹۲

[23]۔الحج ۲۲:۴۰

[24]۔البقرہ ۲:۱۹۱

[25]۔الانفال ۸:۷۳

[26]۔النحل ۱۶:۹۱

[27]۔الانفال ۸:۵۶-۵۸

[28]۔النحل ۱۶:۹۲

[29]۔التوبہ ۹:۱۳

[30]۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الاحزاب، حدیث رقم: ۳۸۰۴

[31]۔بدائع الصنائع، ۷۷/۶

[32]۔النووی، یحییٰ بن شرف، المجموع شرح المھذب، دارالفکر القاھرۃ، ۱۹۶۷ء، ۲۱۴/۲۱

[33]۔النساء ۴:۷۵

[34]۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، الجہاد فی الاسلام، ادارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ اردو بازار لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۴۰

[35]۔ اسلام کا قانون بین الممالک، ص ۲۷۵-۲۷۶

[36]۔ ایضاً، ص ۳۷۲-۳۷۳

[37]۔ حسن بن عبداللہ، آثار الاول فی ترتیب الدول، دار الجبل بیروت، ۱۹۸۹ء، ص ۳۲۸

[38]۔ البقرہ ۱۹۰: ۲-۱۹۴

[39]۔ الجہاد فی الاسلام، ص ۶۳

[40]۔ الانفال ۶۰: ۸

[41]۔ بدائع الصنائع، کتاب السیر، ۵۸/۶

[42]۔ النحل ۱۲۶: ۱۶

[43]۔ البقرہ ۱۹۰: ۲

[44]۔ المبسوط، کتاب السیر، باب معاملۃ الجیش مع الکفار، ص ۳۶/۱۰

[45]۔ السجستانی، سلیمان بن الاشعث، سنن ابی داؤد، دارالسلام لوئر مال لاہور، ۱۴۲۷ھ، کتاب الجہاد، باب: فی دعاء المشرکین، حدیث رقم: ۲۶۱۳

[46]۔ السرخسی، ابو بکر محمد بن احمد بن ابی سہل، شرح کتاب السیر الکبیر (تحقیق: الدکتور حسن اسماعیل الشافعی) دارالکتب العلمیۃ بیروت، ۱۹۹۷ء، ۷۸/۴

[47]۔ الحمیری، ابن ہشام، محمد عبدالملک، السیرۃ النبویۃ، دار ابن حزم بیروت لبنان، ۲۰۰۹ء، ص ۳۹۳

[48]۔ القشیری، مسلم بن الحجاج، صحیح مسلم، قدیمی کتب خانہ کراچی، ۱۹۶۱ء، کتاب الجہاد والسیر، باب تأمیر الامام الامراء علی البعوث ووصیتہ اباھم، حدیث رقم: ۳۲۶۱

[49]۔ البقرہ ۲۰۵: ۲

[50]۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب: فی النھی عن النھبی، حدیث رقم: ۲۷۰۳

[51]۔ ایضاً، کتاب الجہاد، باب مایؤمر من انضمام العسکر وسعتہ، حدیث رقم: ۲۶۲۹

[52]۔ ایضاً، کتاب الجہاد، باب: فی الرسل، رقم الحدیث: ۲۷۶۱

[53]۔ ابن سعد، ابو عبداللہ محمد، الطبقات الکبریٰ، دار اصادر بیروت، ۱۹۵۸ء، ۳۴۷/۱-۳۴۶

[54]۔ الانفال ۵۸: ۸

[55]۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب: مرجع النبی ﷺ من الأحزاب، حدیث رقم: ۳۱۱۷

[56]۔ سیرت النبی ﷺ از شبلی نعمانی، ۳۴۳/۱

[57]۔الترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسی، جامع ترمذی، (مترجم: مولانا بدیع الزماں) نعمانی کتب خانہ اردو بازار لاہور، ۲۰۱۲ء، کتاب السیر، باب ماجاء فی الغدر، حدیث رقم: ۱۵۰۶

[58]۔ سیرۃ ابن ہشام، ص ۵۰۴

[59]۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب یقاتل من وراء الامام ویتقی بہ، حدیث رقم: ۲۹۵۷

[60]۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب: یقاتل من وراء الامام ویتقی بہ، حدیث رقم: ۲۷۳۷؛ صحیح مسلم، کتاب الامارہ، باب: الامام جنۃ یقاتل من ورائہ ویتقی بہ، حدیث رقم: ۳۴۱۸

[61]۔ابویوسف، یعقوب بن ابراہیم، کتاب الخراج، المطبعۃ السلفیۃ القاہرۃ، ۱۳۹۶ھ، ص ۲۱۵

[62]۔الانفال ۱۵: ۸-۱۶

[63]۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب: الحرب خدعۃ، حدیث رقم: ۳۰۳۰

[64]۔ سیرۃ ابن ہشام، ص ۴۶۰-۴۶۱

[65]۔شرح السیر الکبیر، باب الحرب خدعۃ، ۱/۸۵-۸۶

[66]۔ محمد ۴: ۴۷

[67]۔المبسوط، کتاب السیر، باب مااصیب فی الغنیمۃ مما اِصابہ المشرکون من مال المسلم، ۱۰/۳۳۷

[68]۔ابن رشد، محمد بن احمد، بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، مکتبہ مصطفیٰ باز الریاض، ۱۹۹۵ء، ۱/۲۷

[69]۔شرح السیر الکبیر، ۴/۸۷

[70]۔المبسوط، کتاب السیر، ۱۰/۱۸-۱۹

[71]۔العسقلانی، ابوالفضل، احمد بن علی ابن حجر، فتح الباری شرح صحیح البخاری، دار الکتب العلمیۃ بیروت، ۲۰۰۲ء، ۶/۱۰۱

[72]۔الشوکانی، محمد بن علی، فتح القدیر، مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر ۱۳۵۰ھ، ۴/۳۰۶

[73]۔الانفال ۷۰: ۸

[74]۔الجہاد فی الاسلام، ص ۲۶۴-۲۶۵

[75]۔الانفال ۴۱: ۸

[76]۔ابویوسف، یعقوب بن ابراہیم، کتاب الخراج، المطبعۃ السلفیۃ القاہرۃ، ۱۳۹۶ھ، ص ۱۸؛ بدائع الصنائع، ص ۷/۱۱۶

[77]۔آل عمران ۱۶۱: ۳